اسلام
میرے موروثوں کا مذہب

آغا خان سوم

اسلام

میرے موروثوں کا مذہب

ہز رائل ہائینس پرنس آغا خاں سوم کی خود نوشت سوانح عمری

دی میمائرس آف آغا خان کا ایک باب

ترجمہ : جون ایلیا

سائمن اینڈ شُسٹر، نیویارک

شائع کردہ

دی اسماعیلیہ ایسوسی ایشن برائے پاکستان

۱/۲۳۰ ڈکرہ ذرروڈ گارڈن ایسٹ کراچی ۳

جُملہ حقوق محفوظ

بار چہارم ——————— ۱۹۷۵ء

تعداد اشاعت ——————— ۱۰۰۰

مطبوعہ: عباسی لیتھو آرٹ پریس - لیاقت روڈ - کراچی

اسلام میرے موقف کا مذہب

اگر انسان کی مذہبی امنگوں کے سرچشموں کو تلاش کرنا ہے تو وہ اس شے میں ملیں گے جسے آج سائنس کہا جاتا ہے۔ جن لوگوں نے دیومالا اور قدیم ترین نفسیات کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ جادو نے اپنی گوناگوں شکلوں میں قدیم انسان کے اندر خیالات کے نوع بنوع سلسلے پیدا کئے ہیں۔ جن کے ذریعے اس نے اُن مظاہرِ فطرت کی اپنے نزدیک ایک عقلی توجیہہ پیش کی جو اس کے گرد و پیش پھیلے ہوئے تھے۔ وہ اس بات کو بالکل معقول سمجھتا تھا کہ یہ مظاہر اور واقعات مثلاً سورج کا نکلنا اور ڈوبنا، موسموں کا بدلنا، کلیوں کا کھلنا، پھلوں کا پکنا اور باد و باراں سب کچھ دیوتاؤں اور اعلےٰ ہستیوں کے قبضہ و اختیار میں ہے۔

قدیم عہد کا مذہبی تجربہ اور سائنسی استدلال دونوں جادو اور سحر کاری کی صورت میں ایک دوسرے سے منسلک تھے۔ اس طرح ایک ہی وقت میں انسان نے

محسوسات کی اس دُنیا میں جو تجربات حاصل کیے اور ان تجربات کے ساتھ ہی اُن کی توجیہہ اور تطبیق کے سلسلے میں جو ذہنی کاوشیں انجام دیں انہوں نے مل کر سائنس اور مذہب دونوں کو جنم دیا۔ یہ دونوں عہد ماقبل تاریخ اور زمانۂ قدیم میں ایک دوسرے سے وابستہ رہے اور جن ابتدائی شہنشاہیتوں کا ہمیں علم ہے ان کے دور میں بھی یہی صورت رہی۔ اس وقت اصل مذہب (PROTORELEGION) اور اصل سائنس (PROTOSCIENCE) کو ایک دوسرے سے جدا کرنا مشکل تھا۔ یہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے تھے جس طرح دو ندیاں جو کبھی مل جاتی ہیں اور کبھی علیحدہ ہو جاتی ہیں۔ مگر ہمیشہ پہلو بہ پہلو بہتی رہتی ہیں۔ عیسوی دور کے آغاز سے پہلے یونانی اور رومی فکر و ثقافت اور قدیم ایرانی اور ہندو فلسفے کا پس منظر یہی رہا ہے لیکن ارسطو نے ان معقولات اور تصورات کو متعارف کرا کے جو خالصتاً مطابق عقل تھے اور مذہبی دہشت اور سِحریت کی ان علامتوں کو دور کر کے جو افلاطون تک کے یہاں نمایاں ہیں اس اختلاط کو زیادہ سائنسی رنگ دیا۔

رومی سلطنت اور تہذیب کے اس عظیم و ضخیم نظام کے زوال پر جسے رومی قوانین اور نظم و نسق نے اتنی صدیوں تک برقرار رکھا تھا یورپ پر دورِ ظلمت چھا گیا۔ ساتویں صدی عیسوی میں روحانی اور عقلی غرض دونوں دائروں اور حلقوں میں انسانی استعداد اور شوقِ مہمات و انکشافات نے ایک تیز رفتار اور شاندار ترقی کی۔ یہ ترقی عرب میں شروع ہوئی۔ میرے مقدس مورث حضرت

محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ابتداء فرمائی اور اس میں قوت و حرکت پیدا کی۔ ہم اس ترقی کو اسلام کے نام سے جانتے ہیں۔ اس کے اثر و نفوذ کی لہر عرب سے چل کر بے حد تیزی اور توانائی کے ساتھ شمالی افریقہ اور وہاں سے اسپین تک جا پہنچی۔

عظیم مسلم فلسفی ابن رُشد نے جسے یورپ میں "ایوریوس" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ انسان کے قابلِ فہم تجربے کی دو قسموں کے درمیان بڑی صراحت کے ساتھ ایک عظیم فرق قائم کیا ہے۔ ایک طرف تو فطرت سے متعلق ہمارا تجربہ ہے جو ہمیں اپنے حواس کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ جہاں سے ہم میں اشیاء کے شمار اور پیمائش کی صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ (اور اس صلاحیت کے ساتھ تمام چیزیں بھی آجاتی ہیں جنہیں یہ صلاحیت نئے امور اور نئی توجیہات کی صورت میں لے کر آتی ہے) اور دوسری طرف ہمارا وہ فوری اور داخلی تجربہ ہے جو نسبتہً زیادہ حقیقی شے سے متعلق ہوتا ہے اس تجربہ کا ہماری فکر اور ذہنی عمل پر بہت ہی کم انحصار ہے بلکہ یہ ہم کو براہ راست حاصل ہوتا ہے۔ میں اسے "مذہبی تجربہ" کہتا ہوں۔ چونکہ ہمارا دماغ مادّی ہے۔ اور اس کے افعال اور افعال کے تمام نتائج مادّی ہیں۔ اس لئے ہم جب بھی کسی خیال یا روحانی تجربے کو الفاظ کے ذریعے ظاہر کرتے ہیں تو دماغ کی یہ مادّی ساخت اعلےٰ اور ماورائے ادراک روحانی تجربے کو بھی لازماً ایک مادّی شکل دے دیتی ہے۔ مگر انسان

ان لوگوں کے بلاواسطہ اور داخلی تجربات کا معروضی طور پر مطالعہ کر سکتا ہے جنہیں مادّی وسیلے کے بغیر روحانی روشنی حاصل ہو چکی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ہم خدا میں رہتے ہیں خدا میں حرکت کرتے ہیں اور ہمارا وجود خدا میں قائم ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ یہ خیال قرآن مجید میں اکثر ظاہر کیا گیا ہے۔ ان الفاظ میں نہیں بلکہ اسی طرح کے خوبصورت مگر زیادہ موزوں الفاظ میں۔ لیکن جب ہم اس قول کے معنی سمجھ لیتے ہیں تو دراصل خود کو براہ راست تجربہ کی اہلیت کا عطیہ حاصل کرنے کے لئے تیار کر رہے ہوتے ہیں۔ فارسی کے عظیم شاعر رومی اور حافظ نے ہمیں اپنے اپنے انداز میں بتایا ہے کہ بعض افراد ترقی کی ایسی فطری اور روحانی صلاحیتیں اور امکانات لے کر پیدا ہوتے ہیں کہ انہیں اس عظیم، ہمہ گیر اور ہمہ سوز محبت کا بلاواسطہ تجربہ ہوتا ہے جو حقیقت کا انسانی روح سے تعلق قائم کرتی ہے۔ حافظ نے کہا ہے کہ عیسیٰ مسیح ایسے افراد اور صوفیا مثلاً منصور حلاّج، بایزید اور دیگر حضرات عظیم تر عشق کی روحانی طاقت رکھتے تھے اور یہ کہ ہم میں سے ہر شخص اس طاقت کا مالک بن سکتا ہے۔ جو حضرت عیسیٰ کو حاصل تھی بشرطیکہ وہ روحِ قدس[1] جو ہمیشہ موجود ہے ہمیں وہ روحانی روشنی عطا فرما دے۔

---

[1] یہ بات سمجھ لینی چاہیئے کہ روحِ قدس کا اسلامی تصوّر اس مسیحی تصوّر سے بالکل مختلف ہے۔ جو تثلیث کے اقنوم ثالث سے تعلق رکھتا ہے۔

لیکن انسانوں کی وسیع اکثریت کے لئے یہ عظیم تر عشق عملاً ممکن چیز نہیں ہے۔ بہرحال ہماری زندگی میں اس کی عدم موجودگی سے جو کمی واقع ہوتی ہے ہم اسے دنیوی افرادِ انسانی سے محبت کرکے پورا کر سکتے ہیں، اس سے ہمیں ایک حد تک وہ روشنی مل جائے گی جو روحِ قدس کی مدد کے بغیر نہیں مل سکتی۔ جو لوگ اس دنیوی اور انسانی محبت کو جاننے اور محسوس کرنے کی سعادت اور خوش بختی سے بہرہ ور ہیں۔ انہیں تشکر اور امتنان کے ساتھ اسے لبیک کہنا اور ایک رحمت شمار کرنا چاہیئے انہیں چاہیئے کہ وہ اسے اپنے لئے مایۂ فخر و ناز خیال کریں۔ مجھے پورا یقین ہے کہ انسان ایک حد تک اعلےٰ تجربات کی استعداد ضرور حاصل کر سکتا ہے اس طرح کہ وہ اس مادی دنیا میں اپنے آپ کو کسی دوسرے انسان کے لئے مکمل طور پر وقف کر دے۔ اس طرح خالص دنیوی نقطۂ نظر سے اور کسی اعلےٰ روحانی زندگی کا ادراک کیے بغیر، ہماری ارضی روح ہمیں آگاہ کرتی ہے کہ اس زندگی کی تمام دولتیں اور وہ تمام چیزیں جو شہرت مال و زر اور صحت سے حاصل ہوتی ہیں۔ اس خوشی کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں رکھتیں جو محبت کے باعث وجود میں آتی اور باقی رہتی ہے۔ محبت جو ایک انسان دوسرے انسان سے کرتا ہے۔ ہم جب اپنے ساتھیوں اور دوستوں میں بیٹھے ہوں اور اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالیں تو اپنی روزمرہ کی زندگی میں اس عظیم نعمت و رحمت کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔

لیکن جس طرح انسانی محبت کی خوشیاں ان سب مسرتوں سے سبقت لے جاتی ہیں جو دولت اور طاقت سے انسان کو حاصل ہوتی ہیں۔ اسی طرح وہ عظیم تر روحانی محبت اور روشنی جو حقیقت کی براہ راست تجلّی کے اعلےٰ تجربہ کا ثمرہ اور خدا کا عطیہ اور اس کی رحمت ہے ان تمام کیفیتوں اور لذتوں سے سبقت لے جاتی ہے۔ جو بہترین اور خالص ترین انسانی محبت سے حاصل ہوتی ہیں۔ ہم سب کو اس عطیے اور نعمت کے لئے ہمیشہ دعا مانگنی چاہیئے۔

اَب مجھے یقین ہے کہ انسان اسلام ــــ خدا کے اس نصب العین کے ذریعے جو مسلمانوں نے پیش کیا ہے یہ بلا واسطہ تجربہ حاصل کر سکتا ہے۔ یہ تجربہ جس کی تشریح الفاظ کے ذریعے نہیں کی جا سکتی۔ لیکن جو انسان کے لئے قطعی اور یقینی امور میں سے ہے۔ مَیں نے اس قسم کے تجربہ پر غیر مسلموں سے کوئی گفتگو نہیں کی ہے۔ مگر مجھے بتایا گیا ہے کہ بدھ مت کے پیروؤں، برہمنوں زرتشتیوں اور عیسائیوں کو مَیں نے شاید سوائے اسپنوزا کے یہودیوں کے متعلق اکثر یہی سُنا ہے یہ براہ راست صوفیانہ تجلّی حاصل ہوئی ہے۔

مجھے یقین ہے کہ بہت سے مسلمانوں کو اور میں یقین رکھتا ہوں کہ خود مجھے ایسے روحانی اشراق اور عرفان کے لمحات حاصل ہوئے ہیں جن کا علم دوسروں تک نہیں پہنچایا جا سکتا اس لئے کہ یہ ایک وہبی شے ہے اکتسابی نہیں۔

مَیں نے ایک خاص حد تک پایا ہے کہ قرآن کریم کی مندرجہ ذیل آیت نے

اگر اسے اس کے خالص غیر مادّی مفہوم میں سمجھا جائے مجھے اور دوسرے مسلمانوں کو بڑی مدد دی ہے اور بڑی بصیرت عطا کی ہے میں اس آیت کے تمام پڑھنے والوں کو متنبہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ وہ اپنے مادّی اور تنقیدی اندازِ نظر کو ایک ایسی چیز کے بارے میں جو علامتی اور تمثیلی ہے، لغوی اور لفظی تشریحات کی اجازت نہ دیں۔ میں ہر قاری سے خواہ وہ مسلمان ہو یا نہ ہو اپیل کرتا ہوں کہ وہ اس آیت کی روح کو پوری طرح قبول کرے۔

"اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اس کے نور کی مثل ایسی ہے جیسے ایک طاق ہے جس میں ایک روشن چراغ ہو اور چراغ ایک شیشے کی قندیل میں ہو اور قندیل گویا ایک جگمگاتا ہوا روشن ستارہ۔ وہ چراغ زیتون کے ایسے مبارک درخت کے تیل سے روشن کیا جائے جو نہ مشرق میں ہے اور نہ مغرب میں اس کا تیل بغیر آگ کے چھوئے آپ ہی آپ روشن رہتا ہے یہ نورٌ علیٰ نور ہے۔ خدا اپنے نور کی طرف جسے چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے۔ اللہ اپنے بندوں کیلئے مثالیں بیان کرتا ہے۔ اور اللہ ہر چیز کو جانتا ہے"

(سورۂ نور ۲۴ آیت ۳۵)

اپنے ذاتی عقائد کے اس تعارف کے بعد اب میں حتی المقدور اسلام کی مختصر اور غیر فنی تشریح و تعبیر پیش کروں گا جو آج کل سمجھی اور برتی جاتی ہے۔ نوعِ انسانی کی موجودہ حالت اپنے تمام خطرات اور مبارزت طلبیوں کے باوجود یقیناً یہ امکان

بھی رکھتی ہے کہ مختلف قوموں کے درمیان نہ صرف مادّی امن قائم ہو بلکہ اس زمین پر خداوندی امن و سکون کا قیام عمل میں آئے۔ اس کوشش میں اسلام اپنا مفید اور تعمیری کردار ادا کر سکتا ہے۔ اور اسلامی دنیا مضبوط اور توازن قائم رکھنے کا ذریعہ ہو سکتی ہے۔ بشرطیکہ اس کو حقیقی معنوں میں سمجھا جائے اور اس کی روحانی اور اخلاقی طاقت کو تسلیم کیا جائے اور اس کا احترام کیا جائے۔

اس لئے میں اسلام کے بنیادی اصولوں کا ایک مختصر مگر واضح خاکہ پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔ ان بنیادی اصولوں سے میری مراد وہ اصول، وہ طرزِ زندگی اور وہ ارکانِ دین ہیں جو مسلمانوں کے تمام فرقوں میں مشترکہ طور پر تسلیم کئے جاتے ہیں۔ اس لئے پہلے میں وہ اسلامی عقائد پیش کروں گا جو سُنّیوں کی وسیع جماعت اور شیعوں کے درمیان مشترک ہیں۔ اس طرح اس عقیدے کو جو ہم سب کو بحیثیت مسلمان متحد کرتا ہے۔ حتی المقدور واضح کرنے کے بعد میں شیعی عقائد کا مختصر خاکہ پیش کروں گا اور شیعوں کی اسماعیلی شاخ کے مخصوص عقائد بیان کروں گا جس کا میں امام ہوں۔

پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ بنیادی تصوّرات اگرچہ سب مسلمانوں میں تسلیم کئے جاتے ہیں مگر اسلام میں اختیارِ مطلق کا کوئی سرچشمہ وجود نہیں رکھتا اور نہ اس کا پہلے کبھی وجود رہا ہے۔ ہمارے ہاں عقیدے کو منظوری کے واسطے پیش کرنے اور اس کی منظوری حاصل کرنے کے لئے رومن کیتھولک کی طرح

کا کوئی پاپائی نظام نہیں پایا جاتا نہ ہمارے یہاں ان اقتالیس اصول کا کوئی وجود ہے جو کلیسائے انگلستان کی اعتقادی حیثیت متعین کرتے ہیں۔ پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اختیار کے دو سرچشمے حاصل تھے ایک دینی جسے ان کی زندگی میں جوہری حیثیت حاصل تھی اور دوسرا دنیوی جو آنحضرتؐ کی زندگی کے حالات و واقعات کے باعث ان کے اس جوہری اور خدا کے ودیعت کردہ دینی اختیار سے منسلک ہو گیا تھا۔

سُنّی مسلک کے مطابق جو مسلمانوں کی اکثریت پر مشتمل ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مذہبی اختیار ان کی وفات کے ساتھ ہی ختم ہو گیا اور انہوں نے اپنے دنیوی اقتدار کا کوئی جانشین مقرر نہیں کیا۔ سُنّی تعلیمات کے مطابق رسولؐ کے وفاداروں، صحابیوں اور ایمان رکھنے والوں نے ابوبکر کو ان کا خلیفہ اور جانشین چن لیا۔ مگر ابوبکر نے صرف ملکی اور غیر دینی منصب اختیار کیا۔ یہ اختیار کسی کو نہ تھا کہ وہ اس مذہبی فضیلت کا جانشین بنے۔ جو براہ راست خدا کے الہام اور وحی پر منحصر تھی۔ کیونکہ رسولؐ اور قرآن نے قطعی طور پر یہ بات ظاہر کر دی تھی کہ محمدؐ خدا کے آخری رسول ہیں۔ پس سُنّی کہتے ہیں کہ پوپ کی طرح کا کوئی منصب متعین کرنا ممکن نہ تھا۔ یہ بات مسلمانوں پر چھوڑ دی گئی کہ وہ قرآن، سنت رسول اور احادیث کی تشریح کریں۔ نہ صرف اسلام کو سمجھنے کے لئے بلکہ اس کے ارتقاء کو صدیوں تک یقینی بنانے کے لئے۔ خوش قسمتی سے قرآن نے خود اس کام کو آسان کر دیا ہے کیونکہ اس

میں کتنی ہی ایسی آیتیں ہیں جو بتاتی ہیں کہ خدا انسانوں سے تشبیہی اور تمثیلی انداز میں خطاب کرتا ہے۔ اس طرح قرآن نے ہر قسم کی تفسیر و تاویل کے امکانات کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا ہے۔ اور کوئی مفسر اور تاویل کرنے والا کسی دوسرے کو غیر مسلم ہونے کا الزام نہیں دے سکتا۔ اسلام کے ایک بنیادی اصول کا کہ قرآن تشبیہی تاویل و تفسیر کے لئے ہمیشہ کھلا ہوا ہے۔ ایک خوشگوار نتیجہ یہ ہے کہ ہماری مقدس کتاب خارجی اثرات کے تحت عائد ہونے والے ذہنی احوال و حدود کے مطابق ہر صدی میں اپنے ماننے والوں کی رہنمائی کرنے اور ان کے خیالات کو روشن کرنے کے قابل رہی ہے۔ یہ بات مسلمانوں میں بڑی وسیع القلبی پیدا کرتی ہے۔ کیونکہ کسی سخت اور خشک قسم کی تاویل نہ ہو سکنے کی وجہ سے مسلمانوں کے تمام مکاتیب فکر اس دعا میں شریک ہو سکتے ہیں کہ وہ قادرِ مطلق اپنی بیکراں رحمت سے عقیدے کی اس غلط تاویل کو معاف فرمائے جو ناواقفیت اور غلط فہمی کی وجہ سے ہو گئی ہو۔

میں اپنے مغربی قارئین کے سامنے نہ تو اسماعیلی عقیدہ پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں جس سے میرا تعلق ہے اور نہ شیعہ عقائد، نہ مجھے اسلامی تصوف کے اس مکتبۂ فکر پر کچھ کہنا ہے جس سے جلال الدین رومی اور بایزید بسطامی ایسے لوگ تعلق رکھتے ہیں۔ اور نہ ان چند جدید سنی مفسروں کے خیالات پیش کرنے ہیں جو بعض عیسائی فرقوں کی طرح قرآن میں ایسی لفظی ہدایت تلاش کرتے ہیں جیسی مذکورہ فرقوں

کے عیسائی عہد نامہ قدیم اور عہد نامہ جدید میں تلاش کرتے ہیں بلکہ میں سنّی فکر کے اس خاص اور مرکزی بہاؤ کے متعلق کچھ بتاؤں گا جس کا سرچشمہ غزالیؒ کے قائم کردہ مکتبۂ فکر میں ملتا ہے اور جس کا اثر اور جس کی تعلیمات صدیوں تک جاری رہی ہیں۔

سب سے پہلے ہمیں اپنے آپ سے یہ سوال کرنا چاہیئے کہ نوع انسان کو مشیتِ الٰہی کا یہ آخری اور قطعی ظہور کیوں عطا کیا گیا اور اس کے اسباب کیا تھے؟ تمام اسلامی مکاتیب فکر اس بات کو بنیادی اصول تسلیم کرتے ہیں کہ صدیوں تک حضرت محمدؐ کی ولادت سے ہزاروں سال قبل مختلف زمانوں میں دنیا کی ان قوموں کے درمیان ہدایت کیلئے پیغمبروں کا ظہور ہوتا رہا ہے۔ جو ذہنی طور پر اتنی ترقی کر چکی تھیں کہ اس پیام کو سمجھ سکیں یہ پیغمبر رحمتِ الٰہی سے منور تھے۔ اس طرح ابراہیمؑ، موسیٰؑ، عیسیٰؑ اور بنو اسرائیل کے تمام انبیاء کو اسلام تسلیم کرتا ہے۔ درحقیقت مسلمان صرف اسرائیلی پیغمبروں ہی تک خود کو محدود نہیں رکھتے بلکہ وہ ماننے کے لئے تیار ہیں کہ دوسرے ملکوں میں بھی ایسے پیغمبر آتے رہے ہیں۔ جو خدا کی طرف سے فیضان یافتہ تھے۔ مثلاً گوتم بدھ، سری کرشن، سری رام ہندوستان میں، سقراط یونان میں، چین کے دانشمند اور ان کے علاوہ ان قوموں اور تہذیبوں کے بہت سے عارف اور ولی جن کا ہمارے پاس کوئی نشان محفوظ نہیں رہا۔ غرض انسانی روح کو کسی وقت بھی ایک خاص طور پر ہدایت یافتہ پیغمبر کے بغیر نہیں چھوڑا گیا۔ ان پیغمبروں پر اس روح کی طرف سے الہام ہوتا رہا ہے۔ جو دنیا کو قائم رکھے ہوئے ہے، اسے گھیرے ہوئے ہے۔ اور جو ہمہ کائنات ہے۔

پھر اس کی کیا ضرورت تھی کہ حضرت محمد صلعم کے پاس خدا کی طرف سے کوئی وحی نازل ہو۔ اس سلسلے میں اسلام کا جواب بہت مختصر اور واضح ہے یہودی وحدانیت نے اپنی عظیم روحانی قوت کے باوجود دو ایسی خصوصیتیں باقی رکھی ہیں جو اس کی وحدانیت کو اسلامی وحدانیت سے بنیادی طور پر مختلف کر دیتی ہیں۔ خدا تمام باتوں کے باوجود بنی اسرائیل کے لئے ایک قومی اور نسلی خدا بن کر رہ گیا ہے۔ اور اس کی شخصیت اس کے اعلیٰ مظاہر سے جو کائنات کی صورت میں جلوہ گر ہیں بالکل جُدا ہو گئی ہے۔ ہندوستان اور چین ایسے دُور افتادہ ملکوں میں عقیدۂ توحید کی خالص شکل شرک (POLYTHEISM) بُت پرستی اور کثرت پرستی (PANTHEISM) الحاد (ATHEISM) کی وجہ سے ایسی خراب ہو چکی تھی کہ اسے (ATHEISM) سے ممیّز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ یہ مقبول اور افسانوی مذاہب سچّی اور قطعی توحید سے پیدا ہونے والے مذہب سے بہت کم مشابہت رکھتے تھے۔ مسیحیت نے مسلمانوں کے لیے اپنی قوت اور معنویت زائل کر دی تھی۔ اس لیے کہ اس نے اپنے عظیم اور عالی شان بانی کو انسانی حیثیت میں نہیں بلکہ خُدا کی حیثیت میں دیکھا جو انسان کی شکل میں متجسّم ہو گیا تھا۔

چنانچہ اس بات کی قطعی ضرورت پیش آئی کہ محمدؐ پر جو دوسروں کی طرح ایک انسان تھے اُس تعلق کے بارے میں وحی نازل ہو جو ذاتِ باری کو اپنی خلق کردہ کائنات سے ہے۔ اس طرح انسان نے جب ایک بار جوہرِ وجود کو سمجھ لیا تو چونکہ وہ خود اپنی روح کی قدر و قیمت جانتا ہے۔ اس لئے اس کا یہ فرض ہے

کہ وہ سیدھا راستہ اختیار کرے جو کائناتی روح کی طرف اس کی جزوی اور انفرادی روح کی مسلسل رہنمائی کرتا رہے اور اسے اس کائناتی روح سے ملا دے جس کے غیر محدود مظاہر میں سے ایک مظہر وہ کائنات ہے جسے ہم اپنی محدود نگاہ سے اپنے مقدور کے مطابق دیکھ پاتے ہیں۔ پس اسلام کے بنیادی اصول کی یہ تعریف ہو سکتی ہے کہ وہ یک حقیقیت (MONOREALISM) ہے نہ کہ ایک وحدانیت (MONOTHEISM) مثال کے طور پر ہر اسلامی عبادت کے اس افتتاحی اعلان پر غور کیجئے۔ اللہ اکبر اس کا کیا مطلب ہے؟ — اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس اعلان کا دوسرا لفظ اللہ کی خصوصیت کو ایک ایسے منشاء اور مصدر سے مشابہ کر دیتا ہے جو ہر شے کو محیط ہے اور جو لا نہایت مکان و زماں، کائنات، حیات، روح اور تمام قابلِ تصور، فاعل اور منفعل قوتوں کو وجود میں لاتا ہے۔ امام حسن نے خدا اور کائنات کے اسلامی نظریہ کی ایک تشبیہ کے ذریعے تشریح کی ہے۔ یہ تشبیہ سورج اور اس کے عکس کی ہے جو کسی چشمے یا تالاب میں پڑ رہا ہو۔ ظاہر ہے کہ چشمے میں سورج کا عکس یا اس کی شبیہہ موجود ہوتی ہے، مگر کتنی بے مایہ اور کس قدر کم حقیقی۔ یہ مشابہت کتنی حقیر اور کمزور ہے۔ جو اس غیر واضح عکس اور اس عظیم و درخشاں کرۂ شمسی کی سفید و گرم روشنی کے درمیان ہے۔ اللہ سورج ہے۔ اور کائنات جیسا کہ ہم اسے جانتے ہیں اپنی تمام تر وسعت اور زمان اپنی تمام تر قدامت کے ساتھ چشمے

کے آئینے میں وجود مطلق کا عکس ہیں اور اس سے زیادہ اور کچھ نہیں۔

یہودی تصوّر آفرینش اور اسلامی تصوّر آفرینش میں بنیادی فرق ہے اسلامی تصوّر کے مطابق تخلیق ایک وقت معین میں کسی منفرد عمل سے عبارت نہیں بلکہ وہ ایک دائم اور مسلسل واقعہ ہے اور خدا ہر ہستی کو اپنی مشیّت اور خیال کے ذریعہ ہر آن سہارا دیئے رکھتا ہے اور قائم رکھتا ہے اس کے ارادے اور خیال کے ماوراء کچھ بھی نہیں ہے، وہ چیزیں بھی نہیں ہیں جو ہمیں قطعی طور پر بدیہی معلوم ہوتی ہیں مثلاً مکان اور زمان۔ اللہ صرف ارادہ کرتا ہے اور کائنات وجود میں آجاتی ہے۔ تمام مظاہر مشیّت الٰہی کے شاہد ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ میں نے اس فرق کی پوری وضاحت کر دی ہے۔ جو ایک طرف تو اسلام کے نظریہ وحدت الٰہی اور وجود باری کے ان تصورات کے درمیان پایا جاتا ہے۔ جو عہد نامۂ قدیم پر مبنی ہیں اور دوسری طرف ہندی مذاہب اور زرد شتیت کے ہمہ اوستی اور ثنوی نظریات کے درمیان پایا جاتا ہے لیکن حقیقت مطلق کو جان لینے اور یہ سمجھ لینے کے بعد کہ کائنات حوادث کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو ارادۂ الٰہی کے مطابق ہے۔ ضروری ہے کہ ہمارے پاس ایک اخلاقی ضابطہ ہو ایک ایسا ضابطۂ عمل جو ہمیں اس غایت اور نصب العین تک پہنچا سکے جس کا خدا ہم سے مطالبہ کرتا ہے۔

اب ہمیں انسان کے ان فرائض کا مطالعہ کرنا چاہیئے۔ جنہیں مسلمانوں

کی اکثریت آیاتِ قرآنی اور سنتِ نبوی کی روح سے مانتی اور جانتی ہے۔
سب سے پہلے یہ سمجھنا چاہیئے کہ انسان کا خدا سے کیا تعلق ہے۔ اسلام میں پادریوں اور راہبوں کا وجود نہیں ہے اور نہ اعترافِ گناہ کی رسم پائی جاتی ہے بس خدا ہی سے براہ راست گناہوں کا اقرار کیا جاتا ہے۔

جو آدمی شادی نہیں کرتا ہے جو پدرانہ ذمہ داریاں قبول کرنے سے انکار کرتا ہے۔ جو شادی کے ذریعے ایک گھر بنانے اور خاندان قائم کرنے کی ذمہ داری نہیں لیتا ہے اس کی سخت مذمت کی جاتی ہے۔ اسلام میں انتہائی ترکِ دنیا اور ترکِ لذات و تعلقات نہیں ہے۔ نہ کوئی رہبانیت ہے۔ فاقہ کشی کرکے جسم کو گھلانا نہیں ہے۔ اس کے علاوہ جسم کو مطیع بنانے کے لئے کسی قسم کی جسمانی تکلیف پہنچانا کوڑے مارنا نہیں ہے۔ اسلام کے نزدیک ایک صحت مند انسانی جسم ایک ایسا آتشکدہ ہے جس میں روحِ مقدس کا شعلۂ فروزاں رہتا ہے اس لئے وہ اس عزت و حرمت کا مستحق ہے کہ عقلمندی اور حفظانِ صحت کے اصولوں کے تحت اُسے صاف اور صحت مند رکھا جائے۔ عبادت کرنا روزانہ کے فرائض میں داخل ہے۔ وہ انسانی جسم کی چنگاری کا اس عالمگیر شعلہ سے براہ راست تعلق پیدا کرتا ہے۔ سال میں ایک مہینے کی روزہ داری جو بالکل قابلِ فہم ہے۔ جسم کی تربیت کا ایک بنیادی حصہ ہے بشرطیکہ اس سے صحت پر بُرا اثر نہ پڑے۔ اس تربیت کے ذریعے جسم تمام ناپاک خواہشوں

کو ترک کر دینے کی استعداد حاصل کرتا ہے۔ زناکاری، شراب خوری، غیبت اپنے ہمسائے کا برا چاہنا ان باتوں کی خاص طور پر سختی سے مذمت کی گئی ہے۔ تمام آدمیوں کو خواہ وہ امیر ہوں یا غریب مادی اور ذاتی طور پر ضرور ایک دوسرے کی مدد کرنی چاہیئے۔ قواعد کی تفصیلات میں اختلاف سہی لیکن مسلم برادری میں عالمگیر باہمی امداد کے اصول کو عام طور پر سب تسلیم کرتے ہیں۔ یہ برادری قطعی اور مکمل ہے اور اس میں ہر رنگ اور نسل کے لوگ شامل ہیں۔ کالے گورے، پیلے اور گندمی سب انسان جسمانی اعتبار سے اولادِ آدم ہیں اور اپنے اندر نورِ الٰہی کی چنگاری رکھتے ہیں۔ ہر آدمی کو حتی الامکان یہ کوشش کرنی چاہیئے کہ یہ چنگاری بجھنے نہ پائے بلکہ ترقی کرکے اس نورِ کامل کے درجے تک پہنچ جائے جس کا تصور رسولِ اسلام نے بستر مرگ پر اپنے آخری کلمات میں ظاہر کیا تھا اور جو اس مبارک حالت کا تصور تھا۔ جسے انہوں نے واضح طور پر اپنا منتظر پایا تھا۔ اسلام کے ماننے والوں کا عدل الٰہی پر عقیدہ ہے۔ اور وہ یقین رکھتے ہیں کہ قضاؤ قدر اور حریت ارادہ ایسے عظیم مسائل کا حل اس سمجھوتے میں ہے کہ خدا جانتا ہے کہ انسان کیا کرنے والا ہے۔ مگر انسان اس کے کرنے یا نہ کرنے میں آزاد ہے۔

جنگ و جدال کی مذمت کی گئی ہے۔ امن عالمگیر ہونا چاہیئے۔ اسلام کے معنی ہیں سلامتی اور امن و امان۔ یعنی بندوں پر خدا کی امان اور بندوں میں ایک

دوسرے کے ساتھ سلامتی کی روش ۔ سود خوری مذموم ہے مگر ہر قسم کی آزاد اور دیانتدارانہ تجارت اور زراعت کی ہمت افزائی کی گئی ہے کیونکہ ان سے خداوندی خدمت کا اظہار ہوتا ہے اور ان جائز پیشوں کے جاری رکھنے اور ان کو ترقی دینے پر انسان کی فلاح و بہبود منحصر ہے۔ سیاسیات کے نقطۂ نظر سے عوامی طرز حکومت سب سے زیادہ مناسب اور صحیح معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اسلامی ممالک میں جہاں مطلق العنان بادشاہتیں رہی ہیں اور تمام اختیارات بادشاہوں کی ذات میں مرکوز رہے ہیں وہاں بادشاہ کے انتخاب کو ہمیشہ ایک بے جان طریقۂ کار کی حیثیت حاصل رہی ہے جس نے محض قوت و اقتدار پر قبضہ جمانے کا قانونی جواز پیدا کیا ہے۔

موت کے بعد عدل الٰہی انسان کے ایمان، عبادت اور اعمال کا جائزہ لے گا۔ جو منتخب بندے ہیں انہیں دوامی زندگی اور تجلی الٰہی کی روحانی خوشی حاصل ہوگی۔ جو گنہگار ہیں ان کیلئے جہنم ہے جہاں وہ افسوس کے ساتھ جلائے جائیں گے۔ کیونکہ وہ اس بات سے بے خبر رہے کہ رحمت خداوندی کی برکتوں اور بخششوں کا استحقاق کس طرح حاصل کیا جائے۔

اسلامی نظریہ دوسرے بڑے مذاہب سے زیادہ آگے جاتا ہے چونکہ وہ تمام موجودات میں وہ مادہ ہو، حیوانات ہوں درخت ہوں یا خود مکان ۔ (SPACE) روح کی موجودگی کا اعلان کرتا ہے۔ خواہ اس کا وجود کتنا ہی خفیف

اور ابتدائی حالت میں کیوں نہ ہو۔ ہر فرد، ہر سالمہ اور ہر ایٹم خدا کی قادرِ مطلق روح سے اپنے طور پر ایک روحانی تعلق رکھتا ہے۔ مگر مرد اور عورت چونکہ سب سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں اس لئے وہ ان دوسری بے شمار موجودات سے بہت زیادہ آگے نکل گئے ہیں جنہیں ہم جانتے ہیں۔ اسلام فرشتوں کا وجود تسلیم کرتا ہے یہ وہ عظیم ارواح ہیں جو انسانی روح کے اعلےٰ ترین درجات تک بلکہ اس سے بھی زیادہ ترقی کر چکی ہیں۔ وہ ان قوتوں کا مرکز ہیں جو کائنات میں بکھری ہوئی ہیں اسلام عیسائیت کی حد تک نہ جاتے ہوئے ارواح خبیثہ کو تسلیم کرتا ہے جو اپنی پرشیدہ ترغیبات کے ذریعہ ہمیں نیکی سے ہٹانے کی کوشش کرتی ہیں۔ اس صراطِ مستقیم سے ہٹانے کی کوشش کرتی ہیں جس کی طرف خدا نے اپنے سب سے زیادہ خاکسار اور سب سے زیادہ عظیم بندوں، ابراہیمؑ، مسیحؑ اور محمدؐ کی دائمی سعادت کے لئے ہدایت و رہنمائی فرمائی ہے۔

اب تک میں نے وہ اصول بیان کیے ہیں جنہیں سب مسلمان مانتے ہیں۔ خواہ وہ کسی بھی فرقے یا اس کی کسی شاخ سے تعلق رکھتے ہوں، خیالات کی روش میں جو اختلاف پیدا ہوا ہے۔ اب میں اس کی طرف آتا ہوں۔ سُنّی سنّت یا حدیث کے لوگ ہیں۔ ان کا کلمہ یا ان کے عقیدے کا اظہار یہ الفاظ ہیں لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ اس میں شیعہ یہ اضافہ کرتے ہیں کہ علی ولی اللہ وصی رسول اللہ۔ لغوی اعتبار سے شیعہ کے معنی چشمہ یا شاخ ہیں

رسولؐ اسلام کسی کو اپنا جانشین اور خلیفہ مقرر کئے بغیر وفات پا گئے شیعہ مکتبۂ خیال کا یہ عقیدہ ہے کہ اگرچہ رسولؐ کی وفات پر وحیٔ الٰہی کا راہ راست سلسلہ بند ہو گیا مگر ہدایت خداوندی کی ضرورت بدستور باقی رہی۔ اور یہ ہدایت ان لاکھوں فانی انسانوں پر نہیں چھوڑی جا سکتی جو اپنے میلانات اپنی خواہشوں اور مادی ضرورتوں کے غلام ہیں۔ جو ایک لمحے میں المناک طور پر لالچ، زورِ تقریر یا مادی فائدے کی فوری خواہش سے گمراہ ہو سکتے ہیں یہ خطرات اس دور میں بھی واضح اور ظاہر تھے جو رسول اکرمؐ کی وفات کے فوراً بعد آیا۔ محمد صلعم جیسا کہ میں نے بتایا دینوی اور روحانی دونوں حیثیتوں سے حاکم اعلیٰ تھے۔ ان کے خلیفہ یا جانشین کے لیے ضروری تھا کہ وہ دونوں حیثیتوں سے اُن کا جانشین ہو۔ اس کو امیرالمومنین بھی ہونا تھا۔ یعنی مومنین کا قائد اور امام المسلمین بھی ہونا تھا یعنی معتقدین کا رُوحانی پیشوا۔ لاطینی مغرب کی ایک مثال سے یہ بات غالباً زیادہ واضح ہو سکے گی "وہ پاپائے اعظم بھی ہوگا اور امپریٹر یعنی دینوی حکمران بھی"

علی علیہ السلام جو رسولؐ کے چچازاد بھائی اور داماد تھے جو رسولؐ کی اس محبوب بیٹی فاطمہ کے شوہر تھے جو تنہا بیٹی بچی تھی۔ جو سب سے پہلے ایمان لائے جو متعدد لڑائیوں میں ان کے بہادر سپہ سالار رہے۔ جن کے متعلق رسولؐ نے اپنی زندگی ہی میں فرما دیا تھا کہ علیؑ کو مجھ سے وہ نسبت ہے جو ہارونؑ کو موسےٰؑ سے تھی۔ جو ان کے بھائی اور دست راست تھے

جن کی اولاد کی رگوں میں خود پیغمبرؐ کا خون دوڑنے والا تھا ایسا شخص حقیقی جانشین ہونے کے لئے مقرر شدہ معلوم ہوتا تھا اور یہی عام طور پر اسلام کی توقع بھی تھی اس لئے شیعوں کا ہمیشہ سے یہ عقیدہ رہا ہے کہ رسولؐ کی وفات کے بعد خداوندی اختیار، ہدایت اور قیادت نے علیؑ کی ذات میں اپنا اظہار کیا جو دینداروں کے پہلے امام اور روحانی پیشوا تھے۔ بہرحال سنیؔ ان کو سلسلہ خلافت کا چوتھا خلیفہ شمار کرتے ہیں جو دینوی اقتدار سے متعلق ہے۔

اس طرح امام رسول کی مذہبی حیثیت میں ان کا جانشین ہے وہ ایسی ہستی ہے جس کی اطاعت فرض ہے۔ اور جو ان لوگوں کی روحانی اطاعت کا حقدار ہوتا ہے جن میں وہ زندگی بسر کرتا ہے۔ سنیوں کا ہمیشہ سے یہ عقیدہ رہا ہے کہ یہ حاکمیت صرف دینوی اور غیر دینی ہے۔ اور اس کا نفاذ صرف سیاسی دائرے میں ہوتا ہے۔ اسی لئے ان کا یہ عقیدہ ہے کہ یہ حکومت و حاکمیت ریاست کے کسی بھی ایسے سیاسی سربراہ سے متعلق ہو سکتی ہے جو قانوناً مقرر کیا گیا ہو۔ جو مثلاً کہیں کا گورنر یا کسی جمہوریت کا صدر ہو۔ مگر شیعہ کہتے ہیں کہ یہ حاکمیت ہمہ گیر ہے اور (دینوی معاملات کی طرح) روحانی معاملات سے بھی تعلق رکھتی ہے۔ اور رسول کے خاندانی وارثوں کی طرف موروثی حق کی رو سے منتقل

ہوتی ہے۔

یہ کس طرح پیش آیا اسے مسٹر جسٹس ارنالڈ نے اپنے اس فیصلے کو جو بمبئی ہائی کورٹ میں ۱۲ نومبر ۱۸۶۶ء کو صادر کیا گیا، بہترین الفاظ میں بیان کیا ہے۔ یہ فیصلہ اس زبردست مقدمے سے متعلق تھا جو میرے دادا کے خلاف دائر کیا گیا تھا اور جس کا ذکر میں کسی دوسری جگہ کروں گا۔ فیصلے کے الفاظ حسب ذیل ہیں۔

(حضرت) عائشہؓ کا اثر جو (حضرت) محمدؐ کی جوان اور مقرب بیوی تھیں اور جو فاطمہؓ اور علیؓ سے بغض و عناد رکھتی تھیں ان کے اپنے والد ابوبکرؓ کے انتخاب کا سبب ہوا (حضرت) ابوبکرؓ کے بعد (حضرت) عمرؓ خلیفہ ہوئے اور ان کے بعد (حضرت) عثمانؓ جن کی وفات پر ۶۵۵ء میں آخر کار حضرت علیؓ خلیفہ مقرر کئے گئے۔ وہ اس وقت بھی بغیر مخالفت خلیفہ نہیں ہوئے (حضرت) عائشہؓ کی مدد سے معاویہ نے جو خاندان بنو امیہ سے تھے (حضرت) علیؓ سے خلافت کے لئے مقابلہ شروع کر دیا اسی زمانے میں جب کہ اس جھگڑے سے متعلق شکوک و شبہات موجود تھے ۶۶۰ء میں حضرت علیؓ کو ایک خارجی یا مسلمان تشدد پسند نے مسجد کوفہ میں شہید کر دیا جو ان دنوں

دریائے فرات کے داہنے یا مغربی کنارے پر مسلمانوں
کا مرکزی شہر تھا وہ مدتوں سے ایک ویرانہ ہے اور بابل کے
کھنڈروں سے کچھ زیادہ فاصلے پر نہیں ہے۔

مسٹر جسٹس ارنالڈ کا فیصلہ بہت واضح اور موثر طور پر بیان کرتا ہے کہ اس شہادت اور اس کے نو سال اور بیس سال بعد حضرت علیؑ کے دونوں بیٹوں حضرت حسنؑ اور حضرت حسینؑ کی شہادتوں کا مسلمانوں کی زندگی اور ان کے خیالات پر کیا اثر ہوا۔ حسنؑ اور حسینؑ جو پیغمبرؐ کے محبوب نواسے تھے جن کو پیغمبرؐ نے لوگوں کے روبرو سرداران جوانان جنت کا خطاب عطا کیا تھا۔ نیز اس المناک اور تلخ دشمنی اور غلط فہمی کا کیا اثر ہوا جو مسلمانوں کے دو خاص فرقوں کے درمیان شدت اختیار کر گئی اور وہ تمام مصائب اور جھگڑے جنہوں نے آنے والی نسلوں کو مصیبت میں ڈالا کس طرح پیدا ہوئے۔

شیعوں کی بہت سی شاخیں ہیں۔ ان میں سے بعض کا عقیدہ یہ ہے کہ روحانی قیادت یا امامت جو حضرت علیؑ سے متعلق تھی ان کی چھٹی نسل میں حضرت اسماعیلؑ کو پہنچی جن کی اولاد میں ہونے اور جن سے امامت حاصل کرنے کا میں خود دعویٰ کرتا ہوں۔ دوسرے شیعوں کا عقیدہ یہ ہے کہ امامت کا سلسلہ زید سے چلتا ہے جو نواسۂ رسول امام حسینؑ شہید کربلا کے پوتے

تھے۔ ان کے سوا دوسرے شیعہ جن میں ایران اور ہندوستان کے شیعوں کی بڑی اکثریت شامل ہے یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ امامت اب زندہ امام سے تعلق رکھتی ہے جو حضرت علیؓ سے بارھویں ہیں جنہوں نے کبھی وفات نہیں پائی جو زندہ ہیں اور جو تیرہ سو سال سے ہمارے درمیان زندگی بسر کر رہے ہیں جو خود تو دکھائی نہیں دیتے مگر ہمیں دیکھتے رہتے ہیں۔ اس عقیدے کے ماننے والے اثنا عشری کہلاتے ہیں۔ خود اسماعیلی گروہ بھی دو جماعتوں میں منقسم ہے۔ ان میں سے ایک جماعت اس زمانے سے پیدا ہوئی جب میرے آبا و اجداد مصر کی فاطمی خلافت کے مالک تھے، ایک جماعت میرے مورث نزار کو مصر کے خلیفہ مستنصر کا جائز وارث تسلیم کرتی ہے۔ جبکہ دوسری جماعت ان کے دوسرے بیٹے خلیفہ مستعلی کو امام مانتی ہے۔

اس زمانے کے بعد سے اسماعیلیوں اور میرے مورثوں اور ان کے پیروؤں کی داستان بڑی پیچیدگیوں سے ہو کر گزرتی ہے۔ اور صدیوں تک اسلامی تاریخ کے نشیب و فراز سے عبارت رہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ گبن نے ایشیا کے شجرۂ نسل و نسب کی تاریکیوں کو صاف کرنے کا کام مایوس کن سمجھ کر چھوڑ دیا تھا۔ بہر حال ان شخصیات اور واقعات کے سلسلہ کا مطالعہ اپنے اندر بیکران دلکشی رکھتا ہے۔ یہ سلسلہ جو مختلف زمانوں میں پھیلا ہوا ہے اور جو اس موجودہ زمانے میں ہم کو ان تمام دور افتادہ

عظمتوں، المیوں اور اسرار سے وابستہ کرتا ہے۔ میرے مورثوں کا مذہب جس پر اکثر جبر و تشدد کیا گیا کبھی فنا نہیں ہوا۔ بعض ادوار میں اسے بہت فروغ حاصل ہوا۔ مثلاً فاطمی خلفاء کے زمانے میں اور بعض اوقات وہ گمنامی میں رہا اور اس کے بارے میں بہت ہی کم جانا گیا۔

مصر میں فاطمی خلافت ختم ہو جانے کے بعد میرے آبا و اجداد پہلے تو شام اور لبنان کے کوہستانی علاقوں کی طرف منتقل ہوئے۔ پھر وہاں سے مشرق کی طرف ایران کے پہاڑوں میں چلے گئے۔ وہاں انہوں نے کوہسار البرز کے درمیان الموت کی چوٹی پر ایک مرکز بنا لیا۔ یہ وہ سلسلۂ کوہ ہے جو بحیرۂ خزر کے جنوبی صوبوں کو ایران کے باقی علاقے سے جدا کرتا ہے۔ یہاں افسانہ و تاریخ دونوں الشیخ الجبل اور اساسین کے اُن عظیم مورو ثی زعماء کی عجیب داستان میں ایک دوسرے سے خلط ملط ہو جاتے ہیں۔ جو تقریباً دو سو سال تک الموت کے مالک رہے۔ اس دور میں اسماعیلی مذہب شام، عراق، خود عرب اور وسط ایشیا میں دُور دُور تک پوری طرح متعارف تھا۔ سمرقند اور بخارا ایسے شہر اس وقت اسلامی علوم و افکار کے عظیم مراکز میں شامل تھے۔ کچھ مدت بعد تیرھویں صدی عیسوی میں اسماعیلیت کی مذہبی دعوت سنکیانگ اور چینی ترکستان تک جا پہنچی۔ تیرھویں اور چودھویں صدی میں ایک ایسا وقت بھی آیا تھا جب اسماعیلی

نظریہ شیعہ مکتبہ فکر میں سب سے زیادہ موثر اور نمایاں تھا۔ لیکن اس کے بعد ایران میں صفوی حکومت کے غالب آجانے پر (خاص طور پر ایران کے شمال مغربی صوبے آذربائیجان میں) اثنا عشری یا دوازدہ امامی فرقے نے اپنا تسلط قائم کر لیا۔ اسماعیلی مذہب کے باقیات پختگی کے ساتھ قائم رہے اور اب بھی ایشیا، مشرقی افریقہ اور ایران کے بہت سے حصوں میں پائے جاتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اسماعیلیت کے تاریخی مراکز تمام دنیائے اسلام میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مثلاً شام کے پہاڑی علاقوں میں دروز پائے جاتے ہیں۔ جو جبل دروز کے حصار میں رہتے ہیں۔ وہ دراصل اسماعیلی ہی ہیں مگر جب میرے خاندان نے مصر سے ہجرت کی تو انہوں نے اس ہجرت کے معاملے میں میرے خاندان کا اتباع نہیں کیا بلکہ وہ میرے مورث خلیفہ مصر الحاکم کی یاد ہی سے وابستہ رہے۔ لیکن انہوں نے اپنے عقائد و نظریات ان خطوط پر قائم کئے جو شامی اسماعیلیوں کے خطوط سے جو اس زمانے میں میرے پیرو ہیں۔ بہت مشابہ ہیں۔ اسی قسم کے اسماعیلی "جزیرے" (مراکز) جنوبی مصر، یمن اور عراق میں موجود ہیں۔ ایران میں ان کے مراکز محلات کے اطراف ہیں ہیں۔ مغرب کی طرف سے ہمدان اور تہران کے جنوب میں ہیں۔ دوسرے مراکز شمال کی طرف خراسان میں مشرق میں یزد اور کرمان کے اطراف میں۔ جنوب کی طرف خلیج فارس کے کنارے بندر عباس سے لے کر پاکستان اور سندھ

کی سرحدوں تک اور اندرون بلوچستان تک پائے جاتے ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے مراکز افغانستان اور خود کابل میں ہیں۔ بہت سے روس اور وسطی ایشیا میں ہیں۔ یارقند، کاشغر کے چاروں طرف اور سنکیانگ کے بہت سے دیہات اور بستیوں میں پائے جاتے ہیں۔ ہندوستان میں بعض ہندو قبیلے ان داعیوں کے ذریعہ جو میرے مورث شاہ اسلام شاہ نے بھیجے تھے۔ مسلمان ہوئے اور خوجہ کے نام سے موسوم ہوئے۔ اسی طرح حال ہی میں ۱۹ویں صدی کے دوران برما میں بھی تبلیغ مذہب کا سلسلہ رونما ہوا۔

اب جب کہ میں اسماعیلیوں کی ابتداء اور اس کے نشیب و فراز اور تبدلات کی مختصر روداد معاصر دنیا کے سامنے لے آیا ہوں یہ برمحل معلوم ہوتا ہے کہ اپنے جدِ امجد کی زندگی اور ان کے کارناموں کا حال کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کروں جو پہلی بار آغا خاں کے نام سے معروف و مشہور ہوئے اور انیسویں صدی عیسوی کے شروع میں تاریخ کی روشنی میں آئے۔ ان کی زندگی جیسا کہ مسٹر جسٹس ارنالڈ نے بیان کیا ہے کہ ایک عجیب و غریب اور مہماتی زندگی تھی وہ کرمان ایسے اہم شہر کے موروثی سردار اور ایران کے طاقتور اور قابل شہنشاہ فتح علی شاہ کے داماد تھے۔ وہ اسماعیلیوں کی موروثی امامت کے علاوہ ایک بڑی جاگیر کے مالک بھی تھے۔

۱۸۳۸ء میں اس وقت کے حکمران شہنشاہ محمد شاہ سے ان کا تنازعہ

ہو گیا جس کے اسباب جسٹس ارنالڈ نے ذیل میں بیان کئے ہیں۔

" حاجی مرزا اباسی جو محمد شاہ کے آتالیق رہ چکے تھے۔ اپنے شاگرد کی حکومت کے پورے دور میں (۱۸۳۴ء - ۱۸۴۸ء) ایران کے وزیر اعظم رہے۔ ایران کا ایک بہت ادنیٰ ذات کا آدمی جو شروع میں آغا خاں کا ملازم رہ چکا تھا اس مختارِ کل وزیر کا خاص منظورِ نظر اور منہ چڑھا بن گیا۔ اس شخص نے اپنے سرپرست کے ذریعے یہ گستاخی کی کہ آغا خاں کی بیٹیوں میں سے ایک کے لئے جو مرحوم شہنشاہ کی نواسی تھی اپنے بیٹے کے لئے شادی کا پیغام دیا۔ ایرانی مورخ کا بیان ہے کہ آغا خاں نے اسے اپنی شدید ترین توہین خیال کیا۔ اور وہ درخواست جو وزیر اعظم نے بڑے اصرار کے ساتھ پیش کی تھی سخت برہمی کے ساتھ مسترد کر دی۔ اس طرح ایران کے سب سے زیادہ طاقتور آدمی کو اپنا جانی دشمن بنا لینے کے بعد آغا خاں نے غالباً یہ محسوس کیا کہ حفاظت کی بہترین صورت ہتھیار سنبھال لینے ہی میں ہے۔ یہ روش غیر منظم ایران کے بڑے جاگیرداروں میں غیر معمولی نہیں تھی۔ کرمان کو اپنا صدر مقام قرار دے کر وہ ۱۸۳۸ء

اور ۱۸۳۹ء کے دوران اور ۱۸۴۰ء کے کچھ حصے میں۔ مختلف عواقب و نتائج کے ساتھ جنگ جاری رکھنے میں مصروف نظر آتے ہیں۔ ۱۸۴۰ء کے آخر میں فوج کی کثرت سے مغلوب ہو کر ان کو مجبوراً راہ فرار اختیار کرنی پڑی اور وہ بڑی مشکل سے اپنی جان بچا کر چند سواروں کے ساتھ بلوچستان کے صحراؤں سے ہوتے ہوئے سندھ پہنچے۔"

میرے دادا جان نے اس غریب الوطنی کے زمانے میں جو آئندہ چند سال تک جاری رہی برطانیہ کے ساتھ بہت تعاون کیا جو پنجاب کے شمال اور مغرب کی طرف ان کی فوجی توسیع اور سلطنت کی توسیع کے سلسلے میں تھا۔ انہوں نے سندھ میں ہلکے سواروں کی ایک فوج بنائی اور اس کو منظم کیا۔ (ان لوگوں کی اولاد آئندہ کئی برس تک میرے لئے کافی پریشانی کا باعث بنی رہی) ۱۸۴۱ء اور ۱۸۴۲ء میں پہلی افغان جنگ کے آخری مراحل میں وہ اور ان کے اسپ سوار قندھار میں جنرل نوٹ کے بہت کام آئے اور جب وہ جنرل نوٹ کے پاس جانے کے لئے سندھ سے روانہ ہوئے تو انہوں نے جنرل انگلینڈ کا بھی ساتھ دیا۔ ان کی ان خدمات کے عوض اور پھر ۱۸۴۳ء اور ۱۸۴۴ء میں فتح سندھ کے سلسلے میں انہوں نے چارلس نیپئر کی جو خدمات انجام دیں ان کے صلے میں حکومت برطانیہ کی طرف سے انہیں پنشن دی گئی۔

۱۸۴۵ء میں میرے دادا بمبئی پہنچے اور جیسا کہ مسٹر جسٹس ارنالڈ نے بیان کیا ہے۔ اس شہر اور اس کے قرب وجوار کی تمام خوجہ آبادی نے بڑے تپاک اور تعظیم کے ساتھ ان کا استقبال کیا ۱۸۴۶ء کے بعد ایک سال یا دو سال تک وہ کلکتے میں سیاسی نظر بند کی حیثیت سے رہے کیونکہ محمد شاہ (شاہ ایران) نے بمبئی ایسی بندرگاہ میں جہاں سے فوراً ہی ایران پہنچا جا سکتا ہو ان کی موجودگی کے بارے میں حکومتِ برطانیہ پر اعتراض کیا تھا۔ بہر حال ۱۸۴۸ء میں محمد شاہ کی حکومت ختم ہو گئی اور میرے دادا سکون واطمینان کے ساتھ بمبئی میں آباد ہو گئے اور وہاں انہوں نے اپنا دربار یا صدر مقام قائم کیا۔ یہ صرف ایک ذاتی نوعیت کا خوشگوار اور عاقلانہ فیصلہ ہی نہ تھا بلکہ اس کا تمام اسماعیلی دنیا کی مذہبی اور جماعتی زندگی پر قابل تعریف اثر مرتب ہوا کچھ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جبر وایذا اور مجنونانہ عداوت کا وہ بھاری بوجھ اب ہٹ چکا تھا۔ جسے اسماعیلی ایک طویل مدت تک برداشت کرتے چلے آئے تھے۔ بمبئی میں دور دراز مقامات جیسے کاشغر، بخارا، ایران کے تمام علاقوں شام، یمن، ساحل افریقہ اور اس کے اس وقت کے کم آباد عقبی علاقوں سے وفد آنے لگے۔

اس زمانے سے اسماعیلیوں کے طرز زندگی یا ان حالات میں، جن میں میرے پیرو اپنے مذہب کی پیروی کر سکتے ہیں کوئی بنیادی یا شدید تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔ آج کل روس سے کوئی وفد نہیں آتا۔ مگر روس اور

وسط ایشیا میں اسماعیلیوں کو کوئی تکلیف نہیں دی جاتی اور وہ اپنی مذہبی زندگی میں بالکل آزاد ہیں۔ البتہ وہ نذرانہ نہیں بھیج سکتے۔ یہ نذرانہ محض ایک علامتی نذرانہ ہوتا ہے نہ کہ کوئی تاوان جیسا کہ اسماعیلیوں کے بعض انتہا پسند دشمنوں نے ظاہر کیا ہے۔

آج کل سنکیانگ، کاشغر اور یارقند سے ہماری کوئی آمد و رفت نہیں ہے۔ کیونکہ سرحد بند ہے۔ اور ایسا نہیں ہے کہ یہ بندش دوسروں کی بہ نسبت خاص اسماعیلیوں کے لئے زیادہ شدید ہو۔ لیکن ہم جانتے ہیں کہ وہ (اسماعیلی) اپنے مذہب کی پیروی میں آزاد ہیں اور وہ بہت راسخ العقیدہ اور مخلص اسماعیلی ہیں۔ ان میں بڑی خود اعتمادی ہے اور انہیں اس بات کا پوری طرح احساس ہے کہ وہ دنیا بھر میں اسماعیلی جماعت کی سب سے اہم برادری ہیں ایران سے وفود اور نمائندوں کی آمد و رفت جاری ہے۔ شام سے وفود اور نمائندے پابندی کے ساتھ ہندوستان آیا کرتے تھے۔ مگر اب میرے خاندان کے افراد وقتاً فوقتاً شام جاتے رہتے ہیں۔ یا پھر میرے شامی پیرو مصر آکر مجھ سے مل لیتے ہیں، زیادہ عرصہ نہیں ہوا کہ میں دمشق گیا تھا۔ جہاں میرے پیروؤں کی ایک کثیر تعداد میری زیارت کرنے آئی تھی۔ تقریباً ان تمام ملکوں میں امام کے نذرانے کا بڑا حصہ اسکولوں، عبادت خانوں اور مختلف مذہبی اور سماجی اداروں کے انتظام پر صرف کیا جاتا ہے۔

مقامی ذمہ داری کا دائرہ بھی کافی وسیع ہے۔ مثلاً شادی اور طلاق کے معاملات پورے طور پر امام کے مقامی نمائندے سے تعلق رکھتے ہیں بعض اوقات اسماعیلیوں کی خوشحال برادریاں اپنے سے کم خوشحال اسماعیلیوں اور انکے اداروں کی امداد کرتی ہیں۔ میں عمومی ہدایات اور احکام جاری کرتا ہوں مگر ہر مقامی برادری کا روزمرہ کا انتظامی کام امام کے نمائندے اور مقامی سربراہ کے ذریعے انجام پاتا ہے۔ تمام وسط ایشیا میں یہ مقامی سربراہ اکثر موروثی ہوتے ہیں۔ لیکن اس سلسلہ میں کوئی عمومی اور باضابطہ طریقہ نہیں برتا جاتا۔ کبھی تو بیٹا اس کا وارث ہوتا ہے اور کبھی پوتا۔ یہ سربراہ کبھی تو وزیر کہلاتا ہے اور کبھی کامدار (یہ خطاب کثرت استعمال سے بگڑ کر کامڑیا ہو گیا ہے) کبھی اسے رئیس یا رائی کہتے ہیں۔ شام میں امام کے نمائندے امیر کہلاتے ہیں۔ وسط ایشیا کے بعض حصوں مثلاً ہنزہ میں لفظ "امیر" وہاں کی مقامی بول چال میں داخل ہو گیا ہے اور مخفف ہو کر "میر" رہ گیا ہے

کسی ایسی مذہبی جماعت کی قیادت و سیادت جو دنیا کے کافی حصوں میں پھیلی ہوئی ہو۔ کیپ ٹاؤن سے کاشغر تک اور شام سے سنگاپور تک کسی سخت ضابطہ کے مطابق قائم نہیں کی جا سکتی۔ اخلاقی حالات، مادی سہولتیں قومی امنگیں اور اندازِ نظر اور نہایت مختلف تاریخی پس منظر، ان تمام باتوں کو ذہن میں رکھنا پڑتا ہے۔ اور ان کے مطابق ناگزیر ذہنی مطابقتیں پیدا کرنی پڑتی ہیں۔

اسی لئے تنظیم میں بہت تنوع اور لچک پائی جاتی ہے۔ مشرقی افریقہ

کے برطانوی پرتگال اور فرانسیسی نوآبادیات یوگنڈا، پرتگالی مشرقی افریقہ، مڈغاسکر، نیٹال اور کیپ کالونی میں اسماعیلی کونسلوں کا انتظامی نظام ایک بہت ترقی یافتہ اور مہذب ہے۔ تعلیم کے منتظمین، جائداد کے کارکن انتظامی اور عدالتی کونسلیں سب کے سب روزمرہ کے انتظامی امور انتہائی محنت سے انجام دیتے ہیں اور میرے عمومی احکامات کے تحت مالیات کا وسیع انتظام بھی کرتے ہیں۔

ہندوستان اور پاکستان میں اسی طرح کا انتظامی طریق کار پایا جاتا ہے۔ مگر وہ نسبتاً کم ترقی یافتہ اور کم منظم ہے برما اور ملایا میں یہ تنظیم افریقہ کے اسماعیلیوں کی تنظیم سے بہت مشابہ ہے۔ شام، ایران، اور پاکستان کا شمال مغربی سرحدی صوبہ اپنی نمایاں انفرادیت، تاریخی پس منظر اور روایات کے حامل علاقے ہیں، یہ تاریخی تبدیلیاں جو صدیوں تک ہوتی رہیں۔ بہت سی دور دراز رہنے والی جماعتوں کی رسائی کا ہونا یا نہ ہونا اور میرے خاندان اور پیروؤں کے درمیان آمدورفت کا ترقی کرنا یہ سب باتیں بہت اثرانداز ہوتی ہیں۔

وسط ایشیا میں اسماعیلیوں کی قیادت بعض خاندانوں میں موروثی طور پر چلی آرہی ہے۔ اور یہ سلسلہ صدیوں سے نسلاً بعد نسلٍ جاری ہے۔ افغانستان، روس اور چینی ترکستان میں میرے پیروؤں کی کیفیت امریہی

ہے جہاں بعض خاندان اسلام لانے کے بعد سے امام کے نمائندے کی حیثیت سے انتظام کرتے چلے آئے ہیں۔ مقامی قیادت ایک نسل سے دوسری نسل تک قریبی رشتے کی بنیاد پر منتقل ہوتی رہتی ہے۔ بعض اوقات موروثی سردار اور بعض اوقات دنیوی حاکم۔ جیسے کہ ریاست ہنزہ کے حاکم کی مثال ہے جو ایک اسماعیلی ہے۔ مذہبی اخوت کا ناظم ہوتا ہے۔

میں ان تمام دور افتادہ جماعتوں سے جو خط و کتابت کرتا ہوں اس پر مقامی ماحول کا اثر ہوتا ہے: بغداد میں میرے خاص نمائندے ہیں جو عرب کے معاملات و امور طے کرتے ہیں۔ اس طرح ایران کے ہر صوبے میں میرے خاص نمائندے ہیں جو اسماعیلیوں کے معاملات کی نگرانی کرتے ہیں۔ یہ لوگ عام طور پر ان خاندانوں کے افراد ہیں جنہوں نے موروثی طور پر غالباً اس زمانہ سے جب سے ان کا تعلق میرے خاندان سے ہوا مقامی اسماعیلی لیڈر پیدا کیے ہیں۔ شام میں ایسے نمائندوں کا ایک خاندان ہے جس کا میرے خاندان کیساتھ مسلسل ایک ہزار سال سے بھی زیادہ عرصہ سے تعلق چلا آرہا ہے۔

اسماعیلیت متحرک ہونے کے باعث ہی اب تک قائم ہے۔ سخت گیری ہماری طرز حیات اور اسلوب فکر کے بالکل منافی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے قواعد کبھی محدود و معین نہیں رہے۔ قواعد و ضوابط کا وہ مجموعہ بھی جو مقدس قوانین کے نام سے جانا جاتا ہے۔ صرف طریق عمل کی ہدایات سے

عبارت ہے۔ یہ قوانین مطلوبہ نتائج سے متعلق مفصل احکام کی حیثیت نہیں رکھتے۔ بعض ملکوں میں مثلاً ہندوستان اور افریقہ میں اسماعیلیوں نے کونسل کا طریقہ قائم کر رکھا ہے جس کے تحت ان کے مقامی کونسلر تمام اندرونی معاملات کا بندوبست کرنے اور مجھے اپنی کارکردگی سے مطلع کرنے کے ذمہ دار ہیں۔ جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں شام، وسط ایشیا اور ایران میں قیادت ان موروثی سرداروں اور لیڈروں سے متعلق رہی ہے۔ جن کی سفارش کی جاتی ہے، جو امام کے نمائندے ہوتے ہیں اور مختلف جماعتوں یا اجتماعات کے انتظام کی دیکھ بھال کرتے ہیں۔ اسماعیلی دنیا کے ان تمام حصوں سے جن سے مسلسل تعلق رکھنا سیاسی طور پر ممکن ہے۔ خط و کتابت برابر جاری رہتی ہے۔ اور وہاں سے میرے پاس رپورٹیں آتی رہتی ہیں ان پر غور کرنا، ان کا جواب دینا، ان خاص مسائل کا حل بتانا جو میرے سامنے پیش کئے جاتے ہیں اور دور دور تک پھیلی ہوئی اس مذہبی جماعت اور تنظیم کا موروثی امام ہونے کی حیثیت سے اپنے فرائض انجام دینا میری زندگی کا کام ہے اور یہ سلسلہ میرے لڑکپن سے چلا آ رہا ہے۔

آجکل اسماعیلی کونسلوں اور امام کے نمائندوں کا زیادہ تر کام خالص سماجی ہے اور اس کا تعلق شادی اور طلاق ایسے معاملات کے باہمی معاہدوں سے ہے۔ اس موضوع پر غالباً مجھے یہ کہہ دینا چاہیئے کہ آج اسماعیلی

دنیا میں جہاں بھی آباد ہیں وہاں انہیں کوئی بھی تکلیف نہیں پہنچائی جاتی اور ان کے عقیدے اور رسوم میں کوئی مداخلت نہیں کی جاتی بشرطیکہ وہ عام ملکی قوانین جیسے تعدد ازدواج سے متضاد نہ ہوں۔ اس بات کو عام طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ اسماعیلیوں میں کوئی شخص دو بیویاں نہیں رکھ سکتا نہ اپنی پہلی بیوی کو صرف وہم یا کسی غیر سنجیدہ اور نا استوار عذر کی وجہ سے طلاق دے سکتا ہے جیسا کہ مغرب میں غلط طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ ہمارے طریق فکر کے مطابق ان دو دلال حالتوں کے لئے عموماً بہت معقول وجوہ موجود ہوتی ہیں۔ افزائش نسل ہر شادی کی بنیادی تمنا اور ضرورت ہے۔ اگر شادی کے کئی سال بعد تک کوئی بچہ پیدا نہیں ہوتا تو اکثر خود بیوی کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کے گھر کو بچوں کے وجود سے رونق حاصل ہو اور ہنسی خوشی، امید اور گہرے سکون کی وہ دولت نصیب ہو جو بچے اپنے ساتھ لاتے ہیں۔ دوسری مثالیں وہ ہیں جن میں شوہر اور بیوی کے درمیان مزاج کے اعتبار سے اتنا اختلاف پایا جاتا ہے کہ فریقین کی خوشی کے لئے طلاق ہی سب سے بہتر حل نظر آتی ہے۔ لیکن خواہ دوسری شادی کی جائے یا طلاق دی جائے بہر حال ہر صورت میں، مختلف کونسلوں یا (جہاں کونسلیں نہ ہوں وہاں) امام کے نمائندوں کا یہ حتمی اور قطعی فرض ہے کہ وہ بیوی کے مفاد کی حفاظت کریں۔ دوسری شادی ہو جانے کی صورت میں پہلی بیوی

کے لئے مکمل معاشی تحفظ کا یقین حاصل کیا جاتا ہے اور اگر طلاق دی جاتی ہے تو اس بات کا خیال رکھا جاتا ہے کہ مالی سمجھوتہ بظاہر مناسب اور فیاضانہ طور پر ہو گیا ہے یا نہیں۔ غیر مسلموں کو یہ بات ضرور سمجھ لینی چاہیئے کہ نظام شادی اور اس کے متعلقات مثلاً طلاق، تعدد ازدواج وغیرہ کا مسئلہ اسلامی نقطۂ نظر سے کلیتاً باہمی معاہدے، رضامندی اور باہمی طور پر قبول کی ہوئی ذمہ داریوں کا مسئلہ ہے شادی کا مقدس تصور اسلامی نہیں ہے۔ اس لیے اس میں بلا واسطہ طور پر مذہبی اہمیت کا کوئی سوال نہیں ہے اور کوئی ایسی مذہبی رسم موجود نہیں جو شادی میں وہ رمزیت اور تقدس پیدا کرے جو دوسرے مذاہب مثلاً عیسائیت اور ہندو مت میں شادی کے ساتھ وابستہ ہے وہ سر بسر اس رسم سے مشابہ ہے۔ جسے مغرب میں سول میرج اور سیکولر میرج (غیر دینی شادی) کہتے ہیں جو رجسٹری کے دفتر میں یا جج کے سامنے ہوتی ہے۔ البتہ خوشی، خوشحالی اور اچھی صحت کے لئے دعائیں مانگی جا سکتی ہیں۔ مگر اس کے سوا اور کوئی مذہبی رسم نہیں ہو سکتی اور یہ بھی محض ذاتی پسند کا معاملہ ہے۔ اس لئے اسلام یا اسماعیلیوں میں باہمی رضامندی اور باہمی سمجھوتے کی شادی کے سوا اور کوئی شادی نہیں ہوتی۔ جیسا کہ میں اشارہ کر چکا ہوں ہماری تمام اسماعیلی جماعتوں میں اسماعیلی کونسلوں اور امام کے نمائندوں کا زیادہ تر کام یہی ہے کہ وہ یہ دیکھیں کہ آیا شادیوں کا اندراج رجسٹر میں ٹھیک طور پر ہو گیا ہے اور آیا یہ اطمینان کر لیا گیا ہے کہ طلاق، اگرچہ وہ کوئی گناہ نہیں

ہے کسی فریق کے مفاد کو نقصان پہنچے بغیر عمل میں آئی ہے۔ آیا عورت کو ممکن حد تک تحفظ دیا گیا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ بچوں کی پرورش کا تحفظ کیا گیا ہے کہ نہیں ؟

گذشتہ ستر سال گواہ ہیں کہ اسماعیلیوں نے جہاں کہیں بھی وہ آباد ہوئے ہیں مستحکم اور مسلسل ترقی کی ہے۔ عثمانی سلطنت کے تحت سلطان عبدالحمید کے دورِ حکومت میں کافی جبر و تشدد پایا جاتا تھا۔ اس کی حکومت میں دوسری اقلیتوں کی طرح انہوں نے بھی بہت مصیبتیں اٹھائیں اور ان کے بہت سے لیڈروں نے اس مطلق العنان حکومت کے آخری دور میں اسیری برداشت کی۔ ترکی کے جدید انقلاب کی آمد کے ساتھ اذیت کا وہ دور ختم ہو گیا اور اب ان وسیع سیاسی تبدیلیوں کے ہوتے ہوئے جو دنیا میں رونما ہو چکی ہیں میرے خیال میں یہ بات معقولیت کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اسماعیلی عام طور پر تمام دنیا میں کافی قابل اطمینان حالت میں ہیں وہ جہاں کہیں بھی آباد ہیں ان کی جماعتیں وہاں کے معاشرے کے خوش خود دار محنتی اور قانون کا احترام کرنے والے عناصر میں شامل ہیں۔

میری پالیسی اپنے پیروؤں کے ساتھ کیا رہی ہے ؟ ہمارا مذہب ہمارا اپنا مذہب ہے۔ آپ اس پر عقیدہ رکھیں یا نہ رکھیں، آپ کسی مذہب کو چھوڑ سکتے ہیں لیکن اگر آپ اس کے اصولوں کو نہیں مانتے تو اس مذہب میں رہنے

اور اس کی اصلاح کا دعویٰ کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔ آپ ان اصولوں کو چھوڑ دینے کا اختیار رکھتے ہیں۔ لیکن آپ ان کو بدلنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ یہ احتجاج نہیں کر سکتے کہ آپ کا تعلق اس خاص فرقے سے ہے جو ان اصولوں کا حامل ہے بہت سے لوگ اسماعیلی مذہب چھوڑ چکے ہیں بالکل اسی طرح جس طرح بعض دوسرے لوگ مختلف وقتوں میں اس میں شامل ہوتے رہے ہیں۔ لاکھوں میں سے بیس آدمیوں کے تناسب سے کراچی اور ہندوستان میں ایک چھوٹا سا گروہ خود کو اسماعیلی ظاہر کرتا تھا لیکن یہ لوگ اپنے آپ کو "مصلح" کہتے تھے۔ چنانچہ سچے اسماعیلیوں نے انہیں اپنی برادری سے خارج کر دیا ہے۔ اسماعیلی عقیدے کو بدلنے کا کبھی سوال ہی پیدا نہیں ہوا۔ یہ عقیدہ ہمیشہ ایسا ہی رہا ہے اور اس کو لازماً ایسا ہی رہنا بھی چاہیئے جو لوگ اس کے قائل نہیں رہے ہیں انہوں نے اسے بجا طور پر چھوڑ دیا ہے۔ ہمیں ان سے کوئی پرخاش نہیں ہے اور ہم ان کے خلوص کا احترام کرتے ہیں۔ سیاسی راہنمائی کے سلسلہ میں کیا صورت ہے؟ میرے مورثوں کا رویہ جس کی میں نے سختی سے پابندی کی ہے یہ رہا ہے کہ اسماعیلیوں کو حکومت کا پوری طرح وفادار اور جاں نثار ثابت ہونے کی نصیحت کی جائے جس کے وہ شہری ہیں۔ خواہ اس حکومت کا دستور شاہی ہو یا جمہوری۔ میرے مورثوں نے اور میں نے اس سلسلے میں اپنے پیروؤں پر کسی طرح سے بھی کبھی کوئی اثر ڈالنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ہم نے انہیں یہی

بتایا ہے کہ از روئے دستور کسی ملک کی قانونی حکومت جس کے تحت وہ زندگی بسر کرتے ہیں۔ لازمی طور پر ان کی مطلق و مکمل وفاداری کی حقدار ہے۔ چنانچہ اگر کوئی حکومت مجھ سے یہ تعاون چاہتی ہے کہ میں اس کی رعایا کو کوئی نصیحت کروں تو اپنے والد اور دادا کی طرح میری نصیحت ہمیشہ یہی ہوتی ہے کہ رعایا کو وفادار اور قانون کا پابند ہونا چاہیئے۔ اگر اسے کوئی سیاسی شکایت ہو تو پھر اسے چاہیئے کہ وفاداری اور اطاعت کے ساتھ اپنی اسی حکومت کی طرف رجوع کرے جسے دستوری اور قانونی حیثیت حاصل ہے اس اصول کی تکمیل کے لیے اپنے پیروؤں کو میں نے یہی ہدایت اور تعلیم دی ہے کہ جو معاملات خدا کے ہیں انہیں خدا سے اور جو قیصر کے ہیں انہیں قیصر سے متعلق رکھو۔

سماجی اصلاح کے معاملات میں میں نے اپنا اثر و اختیار سوچ سمجھ کر اور تدریجی طور پر استعمال کیا ہے۔ میں نے عورتوں کی آزادی اور تعلیم کی ہمیشہ ہمت افزائی کی ہے۔ میرے دادا اور والد کے زمانے ہی میں پردہ ترک کرنے کے سلسلے میں اسماعیلی دوسرے مسلمان فرقوں سے بہت آگے تھے حتیٰ کہ ان ممالک میں بھی جو بہت زیادہ رجعت پسند تھے میں نے پردہ بالکل ختم کر دیا ہے۔ اب آپ کسی اسماعیلی عورت کو نقاب ڈالے ہوئے نہیں دیکھیں گے۔ میں نے ہمیشہ لڑکیوں کے اسکولوں کی ہمت افزائی کی ہے۔ ان علاقوں میں بھی جہاں اس سے پہلے اسکول قطعاً غیر متعارف تھے۔ میں یہ بات فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ میرے اسماعیلی پیرو سماجی بہبود کے معاملے میں ہر اسلامی فرقے سے آگے ہیں۔ بلاشبہ یہ

ممکن ہے کہ بعض افراد انفرادی طور پر اُن کے برابر ترقی کر گئے ہوں۔ لیکن میرا یقین ہے کہ بحیثیت جماعت ہمارے سماجی حالات مثلاً لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے تعلیم کا بندوبست ازدواجی اور خانگی انداز نظر اور رسوم، طلاق پر کنٹرول، طلاق کے بعد بچوں کے لئے انتظام اور اسی نوع کی دوسری باتیں بہت زیادہ ترقی یافتہ ہیں۔ دایہ گری کو متعارف کرانے میں ہمیں پیشرو کی حیثیت حاصل ہے۔ مشرقِ وسطےٰ میں ہم دوسری تمام مسلمان جماعتوں سے بہت پہلے نرسوں کو بچے کی پیدائش کے سلسلے میں تربیت دے چکے ہیں۔ ہندوستان میں لیڈی ڈفرن نرسنگ ایسوسی ایشن کے تعاون سے میں اس زمانے میں جب کہ ان معاملات میں عام فضا خطرناک طور پر حفظانِ صحت کے خلاف تھی، اس قابل ہوا کہ نہ صرف ہندوستان اور برما میں بلکہ افریقہ اور (اور جہاں تک حالات نے اجازت دی) شام و عراق میں تربیت یافتہ دائیوں کی مدد سے بچے کی پیدائش کے معاملے میں ایک جدید نقطہ نظر متعارف کرا دوں۔

افریقہ میں جہاں میں نصیحت اور مشورے کے ساتھ عملی امداد بھی دے سکتا تھا۔ ہم نے مختلف افراد اور مختلف جماعتوں کے روپے کو پوری طرح محفوظ بنیاد پر جمع کر دیا۔ ہم نے ایک انشورنس کمپنی "جوبلی انشورنس" قائم کی جس کے حصص کی قیمت میں سب سے زیادہ اضافہ ہوا ہے ہم نے ایک اور ادارہ بھی قائم کیا جس کا نام انوسٹمنٹ ٹرسٹ رکھا گیا، جو دراصل ایک وسیع تنظیم ہے

جس کا کام روپیہ اکٹھا کرنا اور منافع کی معمولی شرح پر اسماعیلی تاجروں اور ان لوگوں کو قرض دینا ہے جو مکان خریدنا یا بنانا چاہتے ہیں۔

میری ذاتی دولت کے متعلق خرافات کا ایک طومار لکھا جا چکا ہے۔ امریکہ میں ایسے سینکڑوں لوگ موجود ہیں جن کے پاس مجھ سے کہیں زیادہ دولت ہے اور یہی صورت یورپ میں ہے لیکن امریکہ میں بھی ایسے آدمی غالباً زیادہ نہ ہوں گے جنہیں انکم ٹیکس ادا کرنے کی وجہ سے اپنی آمدنی پر وہ قابو حاصل ہو جو مجھے حاصل ہے۔ مگر اس قابو کے ساتھ ہی یہ بھی ہے کہ ایک غیر تحریری قانون کی صورت میں مجھے اپنے اسماعیلی پیروؤں کے مختلف جماعتی، سماجی اور مذہبی اداروں کی نگہداشت کرنی پڑتی ہے اور آخر میں اس آمدنی کا ایک قلیل حصہ اگر باقی رہا ہو میرے اور میرے خاندان کے افراد کے لئے بچتا ہے۔ جب میں اس لاکھوں پونڈ سالانہ آمدنی کے متعلق پڑھتا ہوں جس کا مجھے مالک سمجھا جاتا ہے تو میں یہی سوچتا ہوں کہ اگر میری اتنی ہی آمدنی ہوتی تو مجھے اپنے آپ سے شرم آتی۔ اینڈریو کارنیگی کے اس قول میں بڑی صداقت پائی جاتی ہے کہ "جو آدمی دولت مند ہو کر مرتا ہے۔ وہ ذلیل ہو کر مرتا ہے" مجھے اس میں یہ اضافہ کرنا چاہیے کہ "جو شخص دولت مند ہو کر جیتا ہے وہ ذلیل بن کر جیتا ہے۔" دولت مند ہو کر جینے والے سے میری مراد وہ شخص ہے جو اپنی ذاتی خوشی کے لئے اپنے ملک کے اس طبقہ کی سطح اور معیار زندگی

سے بھی زیادہ خرچ کرے جو آج کل "زیادہ آمدنی والا طبقہ" کہلاتا ہے۔ میں کمیونسٹ نہیں ہوں، نہ میرا یہ خیال ہے کہ کچی زندگی کا بلند معیار کوئی گناہ اور معاشرے کے ساتھ کوئی گستاخی ہے۔ میں تین یا چار کاریں رکھنے پر کوئی شرم محسوس نہیں کرتا۔ ہندوستان میں جہاں بہت سے آدمی باہر سے آتے اور جاتے رہتے ہیں۔ میں ان کے استعمال کے لئے زیادہ کاریں رکھتا ہوں۔

نہ میں گھوڑ دوڑ کے ایک بڑے اصطبل کا مالک ہونے پر شرمندہ ہوں۔ جس کے متعلق آئندہ کسی باب میں کچھ بیان کروں گا۔ جیسا کہ میں بتا چکا ہوں شہسواری کی تمام اقسام سے میرے خاندان کا ایک طویل، باعزت اور پرخلوص تعلق رہا ہے۔ اگر میں یہ سوچتا کہ اپنے زیر تربیت گھوڑوں .... کی ایک بڑی تعداد کو بیچ ڈالوں یا منفعت حاصل کرنے کے لئے ان کو تجارتی اصول پر چلاؤں تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ میں کسی بھی دن گھوڑوں کی ایک کافی تعداد فروخت کر کے اسے ایک منفعت بخش تجارت میں منتقل کر سکتا تھا لیکن میرے دادا، میرے والد اور میں نے گھوڑ دوڑ کو کبھی روپیہ کمانے کا ذریعہ نہیں سمجھا اسے ایک قسم کا کھیل ہی خیال کیا جو محتاط توجہ اور ہوشمندانہ انتظام کے بعد اپنا خرچ خود ہی پورا کر سکے اور بحیثیت مالک نہ صرف خود ہمارے لئے بلکہ ان ہزاروں اور لاکھوں آدمیوں کے لئے تفریح کا ایک مستقل ذریعہ بن سکے۔ جو گھوڑ دوڑ کے میدان میں ہمارا ساتھ دیتے ہیں۔

ہم نے اپنے گھوڑوں اور اصطبلوں کو ان ملکوں کے لئے جہاں انکی پرداخت اور نگرانی کی جاتی ہے۔ دولت آفرینی اور گھوڑوں کی اچھی نسل کو محفوظ رکھنے اور بڑھانے کے نقطۂ نظر سے عملی فائدے کا ذریعہ سمجھا ہے۔

ہمارے خاندان کے خلاف فضول خرچی کا ایک خاص الزام اس دور میں لگایا گیا تھا۔ جب کہ جیسا میں کسی دوسری جگہ بیان کر چکا ہوں کہ تقریباً دو ہزار آدمی روزانہ ہمارے ساتھ رہتے تھے اور ہمارے اخراجات پر زندگی بسر کرتے تھے۔ بہرحال یہ دو ہزار آدمی ان لوگوں کی اولاد اور متعلقین تھے جو میرے دادا کے ساتھ ایران سے جلاوطن ہو کر اور اپنے مکانات اور جائدادوں کو چھوڑ کر آئے تھے۔ اس وقت کے حالات کے پیشِ نظر ہم اسماعیلی جماعت کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے ان کی بہبود اور نگہداشت کے ذمہ دار تھے جتنی جلدی مجھ سے ہو سکا اور جتنے بہتر طریقے سے میں کر سکا۔ میں نے اس مسئلے کو طے کیا۔ یہاں تک کہ اب ان لوگوں کی اولاد پہلے سے کہیں زیادہ خوش اور خود اعتماد ہے۔ میں نے جس طرح اسے طے کیا اس سلسلے میں میرے دل پر کوئی بوجھ نہیں ہے۔

مجھے دولت کی جس افسانوی مقدار کا مالک بتایا جاتا ہے۔ اگر میرے پاس اس کا دسواں حصہ بھی ہوتا تو میں ایک بہت ہی ناخوش انسان ہوتا۔ کیوں کہ اس صورت میں مجھے زندگی بھر یہ احساس رہتا کہ میں ایک مردہ

بوجھ لیئے پھر رہا ہوں۔ جو میرے خاندان میرے احباب اور نتیجتہً میرے پیروؤں کے لئے بھی بے کار ہے۔ ایک خاص حد تک آگے بڑھ کر دولت اور اس سے حاصل ہونے والے مادی فوائد افراد اور معاشروں کو نفع کی نسبت نقصان زیادہ پہنچاتے ہیں۔

جہاں تک میرے پیروؤں کے طرزِ زندگی کا تعلق ہے تو میری یہ کوشش رہی ہے کہ میں ان کو جو نصیحتیں کرتا اور جو مشورے دیتا ہوں انہیں اس ملک اور حکومت کے مطابق بدلتا رہوں جس میں وہ زندگی گذارتے ہیں۔ چنانچہ مشرقی افریقہ کی برطانوی نوآبادی میں انہیں میری یہ تاکید ہے کہ وہ انگریزی کو اپنی اوّلین زبان بنائیں اپنے خاندان اور اپنی گھریلو زندگی کی بنیاد انگریزی طریقوں پر رکھیں اور شراب اور تمباکو نوشی کی عادت کو مستثنیٰ کر کے عام طور پر برطانوی اور مغربی رسم و رواج اختیار کریں مجھے یقین ہے کہ لازمی طور پر ایک ایسے سماج میں رہتے ہوئے جو مختلف نسلوں سے مرکب ہو ان کے لئے ایک ایسی سماجی زندگی اور اس سماجی زندگی کی ایک ایسی تنظیم ہونی چاہیئے جو انہیں شخصیتوں کو ترقی دینے کے زیادہ سے زیادہ مواقع فراہم کرے جو عملی طور پر سب سے زیادہ مفید ہو اور وہی ایک ایسی زندگی ہے جس پر انہیں عمل پیرا ہونا چاہیے۔ دوسری طرف جو

لوگ برما میں رہتے ہیں انہیں بھی میں نے یہی مشورہ دیا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی کہ کسی دوسرے طرزِ زندگی کی بجائے انہیں برمی طرزِ زندگی اختیار کرنا چاہیئے۔ مسلم ممالک مثلاً شام، مصر، عراق اور ایران میں کسی قسم کی مشکلات نہیں ہیں۔ خود میرے خاندان کی خانگی اور سماجی زندگی ہمیشہ سے مسلم ایرانی نمونے پر عمل پیرا رہی ہے۔ اور میں چاہے کہیں بھی رہا ہوں اس میں کوئی تشدید اور اساسی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ یہاں تک کہ میں نے جن مغربی خواتین سے یکے بعد دیگرے شادی کی ہے حقیقت یہ ہے کہ انہوں نے نہایت آسانی اور خوشی کے ساتھ مسلم ایرانی انداز نظر اور طرز زندگی اپنا لیا ہے۔

البتہ افریقہ میں میرے پیروؤں کو ایک بہت شدید مسئلے کا مقابلہ کرنا پڑا۔ وہ وہاں ایشیائی عادات اور ایشیائی طرز زندگی لے کر آئے تھے لیکن انہیں ایک ایسے معاشرے سے واسطہ پڑا جو ترقی کے دور سے گزر رہا تھا۔ وہ معاشرہ جسے ہم یورپی افریقی (EUROPEAN-AFRICAN) بھی کہہ سکتے ہیں۔ افریقی معاشرے میں زبان عادات اور لباس کے معاملے میں ایشیائی انداز نظر کا قائم رکھنا ان کے لئے سخت پیچیدگی کا باعث اور آگے چل کر سماجی طور پر دقیانوسیت کا ایک مردہ بوجھ ثابت ہوتا۔ پاکستان اور جدید بھارت میں اسماعیلی آگے چل کر شاید دو بالکل مختلف

تہذیبی نمونے اختیار کریں گے۔ مغربی پاکستان میں غالباً اردو زبان بولیں گے یا وہ زبان جسے ہندوستانی کہا جاتا تھا اور ان کی سماجی عادات اور رسوم اس کے مطابق ڈھل جائیں گی۔ مشرقی پاکستان میں بنگالی لباس اور بنگالی زبان اسماعیلی طرزِ زندگی میں اہم کردار ادا کریں گے۔ بھارت میں وہ غالباً وہ گجراتی اور مرہٹی زبانیں بولیں گے اور ان کا اندازِ نظر اور طرزِ زندگی گجراتی مرہٹی شکل اختیار کرے گا۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ وہ جب تک اپنے عقیدے پر قائم رہیں گے۔ اسلامی اخوت ان مختلف سماجی زاویہ ہائے نظر اور طرزِ ہائے زندگی رکھنے والے تمام لوگوں کو متحد اور روحانی طور پر ایک دوسرے سے وابستہ رکھے گی